علامہ اقبال کے ایک ناقد: ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری

ڈاکٹر خالد ندیم

جولائی ۱۹۳۵ء میں انجمن ترقی اُردو، اورنگ آباد کے جریدے اُردو میں شائع ہونے والے ایک مضمون 'ادب اور زندگی' میں معروف ترقی پسند نقاد ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے اقبال پر شدید تنقید کی۔ ایک وقت تک وہ اپنے خیالات کا دفاع کرتے رہے، تاہم زمانے کے سرد و گرم سے آشنا ہونے اور اقبال کے بالاستیعاب مطالعے کے بعد وہ اپنی رائے سے رجوع کرنے لگے، غرض بھرپور علمی زندگی گزارنے کے بعد اُن کا دائرۂ فکر وسعت اختیار کرتا چلا گیا، چنانچہ جب وہ ۱۹۷۶ء میں سفرِ حیات کی گرد سمیٹتے ہوئے خودنوشت [گرد راہ] لکھنے بیٹھے تو اقبال کے فنی کمالات اور فکری رویوں کے معترف ہوتے چلے گئے۔

ترقی پسند تحریک کے سرگرم رُکن، ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری (۱۲/ جون ۱۹۱۲ء - ۲/ جون ۱۹۹۲ء) بظاہر علامہ اقبال کے معاصر شمار ہوتے ہیں، مگر وہ علامہ سے پینتیس برس چھوٹے تھے۔ بیسویں صدی کے رُبع دوم میں وہ نقاد، افسانہ نگار اور مترجم کی حیثیت سے نمایاں ہوئے تو رُبع آخر میں پچاس سالہ علمی و ادبی اور تہذیبی و ثقافتی تاریخ کی حامل خودنوشت لکھ کر انھوں نے اپنا نام امر کر لیا۔[1] رائے پور، کلکتہ، علی گڑھ اور پیرس[2] سے تعلیمی مدارج طے کرنے والے اختر کو آٹھ زبانوں[3] پر یکساں قدرت حاصل تھی۔ انھوں نے آل انڈیا ریڈیو، دہلی میں [خبروں کے] مدوّن و مبصر اور ہندوستانی لغت کمیٹی کے نگران کی حیثیت سے کام کیا؛ ایم اے او کالج، امرتسر میں تدریسی فرائض انجام دیے؛ حکومتِ ہند اور حکومتِ پاکستان کی وزارتِ تعلیم میں[4] انتظامی خدمات انجام دیں اور اقوامِ متحدہ کے ذیلی ادارے یونسکو کے تحت مختلف ملکوں[5] میں فروغِ علم کے سلسلے میں مصروف رہے۔

علامہ اقبال سے اختر کا پہلا رابطہ ۱۸/ مارچ ۱۹۳۳ء کو ہوا، جب کمال اتا ترک[6] کے دیرینہ رفیق رؤف بے[7] پیرس سے جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی کی دعوت پر، علامہ کی زیرِ صدارت، دو توسیعی لیکچر دینے ہندوستان آئے۔

رؤف بے نے وطنیت اور اتحاد اسلامی کے موضوع پر گفتگو کی اور اتاترک کی سیکولر پالیسی کو سراہا۔ اقبال نے بحیثیت صدرِ جلسہ، عالمِ اسلام کی تازہ بیداری، انقلابِ ترکی، مسئلہ اجتہاد، خلافت اور اتحاد اسلامی (مغربی اصطلاح کے مطابق پان اسلام ازم) ایسے موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔[۸]

اختر، اقبال کی شاعرانہ خوبیوں کے گرویدہ تو تھے ہی، یہ خطاب سن کر اقبال سے ملاقات کے لیے بے چین ہو گئے، چنانچہ ملاقات کا وقت طے کر کے اور چند سوالات مرتب کر کے اگلے دن علامہ کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔[۹]

اقبال، ڈاکٹر انصاری[۱۰] کی رہایش گاہ پر ایک کمرے میں پلنگ پر لیٹے حقہ پی رہے تھے اور ان کا دیرینہ ملازم علی بخش[۱۱] دروازے پر بیٹھا تھا۔ اقبال تنہا تھے، لہٰذا بلا تامّل اختر کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اختر کے سوالات سن کر علامہ کہنے لگے کہ اب مجھے ایسے نوجوان نہیں ملتے، جن کے ذہن میں علم کی کرید ہو؟[۱۲]

جب انھیں معلوم ہوا کہ اختر، میوات کے باغی کسانوں کا حال دیکھ کر ان سے ملاقات کے لیے دہلی میں ٹھہرے ہوئے ہیں تو مسکرا کر کہنے لگے: معلوم ہوتا ہے کہ تم تعلیم کی طرف توجہ کم دیتے ہو، ورنہ ان مشاغل کے لیے وقت کیسے نکل سکتا ہے۔

اختر نے عرض کیا کہ مَیں تجسس کی اس منزل پر ہوں، جب رسمی تعلیم تضیع اوقات محسوس ہوتی ہے۔ مَیں حقیقت کا جویا ہوں اور اسی کو حاصل علم تصور کرتا ہوں۔ آپ جیسے بزرگوں کے فیض سے جو حاصل ہوگا، وہ کسی درس گاہ میں کب میسر ہوگا؟

اس جواب پر اقبال محظوظ ہو کر اٹھ بیٹھے اور پوچھا کہ تمھارے ذہن میں حقیقت کا تصور کیا ہے؟ اختر نے عرض کیا:

> مَیں ابھی معاشی مسائل سے زیادہ سوچنے کی صلاحیت پیدا نہیں کر سکا اور یہ سمجھتے ہوئے بھی کہ انسان کا مقدر بھوک اور شہوت کی تسکین کے علاوہ اور بھی کچھ ہے، اسی اُلجھن میں ہوں کہ ان بنیادی مسائل کا مناسب حل نکل آئے تو پھر انسان اپنی خفتہ صلاحیتوں کو صحیح طور پر بہ رُوے کار لا سکے گا۔

اقبال نے کچھ دیر انھیں غور سے دیکھا اور فرمایا:

> بھوک اور شہوت کے مسائل حیوان اور انسان میں مشترک ہیں۔ جو قدر ان میں امتیاز پیدا کرتی ہے وہ فلسفے کی اصطلاح میں 'آئیڈیا' ہے۔ یہ ایک ایسا جذبہ ہے جو ایمان، ضمیر، اخلاق، مسلک وغیرہ کی شکلیں اختیار کرتا ہے۔ سوچو کہ انسان کی بہتری اور ترقی کی جدوجہد میں جن لوگوں نے مصائب جھیلے ہیں انھیں ان قربانیوں کے لیے کسی نے مجبور نہیں کیا۔ کسی نورِ ایمان نے انھیں اس کاوش کے لیے ابھارا [ہوگا]۔ یہی جذبہ انسانیت کا جوہر اور اس کی سربلندی کی ضمانت ہے۔[۱۳]

اختر دیر تک اقبال سے محوِ گفتگو رہے، بوقتِ رخصت اقبال نے انھیں ملتے رہنے کی تاکید کی؛ چنانچہ اختر جب بھی لاہور آئے، اقبال کی خدمت میں ضرور حاضر ہوئے۔ (البتہ ان ملاقاتوں کی تفصیل دستیاب نہیں ہو سکی) یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اقبال بعض باتوں میں متفق نہ ہونے کے باوجود اختر پر شفقت فرماتے تھے۔[14]

مارچ ۱۹۷۱ء تک مذکورہ سوال و جواب پر مشتمل مسودہ اختر کے پاس محفوظ رہا۔ وہ اسے ایک مضمون کی صورت میں شائع بھی کرنا چاہتے تھے؛[15] تاہم ۱۹۸۴ء میں، جب ان کی بینائی زائل ہوگئی اور مسودہ بھی کہیں کھو گیا، تو اختر نے بتایا کہ اگر اُس زمانے میں یہ مضمون شائع ہو جاتا تو ایک شور برپا ہو جاتا، [البتہ] اقبال کی شاعرانہ عظمت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا، [ہاں] ان کے خیالات سے اختلاف کیا جا سکتا ہے۔[16]

۱۹۳۷ء کے آغاز میں جہاں نما کے ڈیکلریشن کے لیے دی گئی درخواست مسترد ہونے پر ان کی اہلیہ حمیدہ (پ: ۱۹۱۸ء) نے انھیں یورپ جا کر ڈاکٹریٹ کرنے کی تجویز پیش کر دی۔ اختر کہتے ہیں کہ میں ان کی شکل دیکھتا رہ گیا، کیوں کہ یہ خیال کبھی میرے دماغ میں نہ آیا تھا۔[17]

اختر کا یہ بیان اپنی جگہ، لیکن راقم کو ایک ایسی تحریر دستیاب ہوئی ہے، جس سے ایک طرف اختر کے اس بیان ...... یہ خیال کبھی میرے دماغ میں نہ آیا تھا...... کی تردید ہو جاتی ہے تو دوسری جانب اقبال سے اختر کے تعلقات کی نوعیت کا بھی علم ہوتا ہے۔ ۲۶/ اپریل ۱۹۳۴ء کو علامہ اقبال نے ان الفاظ میں اختر کی صلاحیتوں اور ان سے وابستہ توقعات کے بارے میں لکھا:

> Mr. Akhtar Husain B.A. (Alig:) is, perhaps, the first eminent Mohammedan scholar of Sanskrit. The all India Sanskrit Vidat Sammelan has recognised his scholarship in that language by conferring on him the title of Sahityalankar. I am told that he knows Bangla, Marathi and Gujrati and is a well known writer in Hindi and Urdu. These qualifications give weight to his intention to proceed to Europe for higher studies in Sanskrit. I strongly recommend him to the trustees of Fazalji Dawood Bhai Trust to whom he is applying for a foreign scholarship. They would do well to give him every encouragement, for I believe, he would put this help to the best account. I hope, he would prove useful to our country and community and revive the traditions of Muslim Sanskrit Scholars of Mughal Period.[18]

اگرچہ مذکورہ ٹرسٹ نے اقبال کی اس سفارش کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا، تاہم اس تحریر سے اقبال کے دل میں اختر کی قدر و اہمیت کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔

علی گڑھ میں قیام کے دَوران (۱۹۳۵ء میں) اختر نے 'ادب اور زندگی'[19] کے نام سے وہ اہم مقالہ لکھا جس نے ۱۹۳۶ء میں قائم ہونے والی انجمن ترقی پسند مصنفین کے لیے فکری اساس مہیا کی۔ اختر نے اس مضمون میں اُردو زبان و ادب کے متعلق جارحانہ رویہ اختیار کیا، بالخصوص علامہ اقبال کے بعض نظریات پر سخت تنقید کی۔

اختر سمجھتے ہیں کہ اقبال کا نظریۂ زندگی بڑی حد تک جمال الدین افغانی[۲۰] سے متاثر ہے اور نیطشے[۲۱]، برگساں[۲۲] اور میزینی[۲۳] کے زیرِ اثر انھوں نے مغربی استعماریت اور صنعتی تہذیب کی مخالفت کی ہے؛ چنانچہ اقبال نے اسلام کے نام پر ایک عالمی تصور پیش کیا ہے جس کا نفاذ، ان کی رائے میں، مسائل حیات کا واحد حل ہے۔ اختر کہتے ہیں کہ یہاں مَیں صرف یہ دکھانے کی کوشش کروں گا کہ اقبال فاشزم کا ترجمان ہے۔

حیرت ہے کہ دیگر ترقی پسندوں کی طرح اختر نے بھی فیصلہ صادر کرنے کے بعد فیصلے کے حق میں مواد کی تلاش شروع کی؛ بہرحال ان کے اعتراضات کی نوعیت کچھ یوں ہے:

☆ اقبال نے ایک قوم کو ہی نہیں، بلکہ اس قوم کے ایک خاص طبقے کو مخاطب کیا ہے، اور یہ طبقہ نوجوانوں کا ہے۔

☆ انھوں نے اقبال کی طرف سے مسلم فتوحات کو اسلام کے عروج اور زوال کو اسلام سے انحراف کی دلیل قرار دینے پر نکتہ چینی کی اور کہا: یہ ثابت کرنا مشکل ہے کہ اسلام کی ابتدائی فتوحات عرب ملوکیت کی فتوحات نہیں تھیں اور تاریخ کے کسی دَور میں اسلامی تصورِ حیات پر عمل ہوا تھا۔

☆ وطنیت کی مخالفت کے باوجود اقبال قومیت کے اسی طرح قائل ہیں، جس طرح مسولینی[۲۴] فرق صرف اتنا ہے کہ ایک کے نزدیک قوم کا مفہوم نسلی ہے اور دوسرے کے نزدیک مذہبی۔

☆ اشتراکیت کے برعکس، فاشسٹوں کی طرح اقبال بھی جمہور کو حقیر سمجھتے ہیں۔

متاعِ معنیِ بے گانہ از دوں فطرتاں جوئی　　ز موراں شوخیِ طبعِ سلیمانے نمی آید
گریز از طرزِ جمہوری، غلامِ پختہ کارے شو　　کہ از مغزِ دو صد خر فکرِ انسانے نمی آید[۲۵]

زمامِ کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو، پھر کیا
طریقِ کوہ کن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی[۲۶]

ہوس اندر دل آدم نہ میرد　　ہماں آتش میانِ مرزغن ہست
عروسِ اقتدارِ سحر فن را　　ہماں پیچاک زلفِ پُرشکن ہست
نماند ناز شیریں بے خریدار　　اگر خسرو نباشد کوہ کن ہست[۲۷]

☆ اقبال مشینوں کو انسانیت کے لیے مضرت رساں سمجھتے ہیں:

ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت
احساسِ مروّت کو کچل دیتے ہیں آلات[۲۸]

جب کہ اختر کے خیال میں آلات خود کچھ نہیں کرتے، بلکہ وہ مخصوص حالات، مروّت کو کچل دیتے ہیں، جن میں ان سے کام لیا جاتا ہے[۲۹] تاہم ستمبر ۱۹۷۶ء تک آتے آتے وہ اقبال کی تائید کرنے لگے تھے کہتے ہیں:

انسان بزعمِ خود مشین کے سہارے فطرت پر غلبہ حاصل کرنے کے لیے نکلا اور اب مشین سے مغلوب ہو کر رہ گیا۔ پہلے تو اس نے مشینوں سے وہ کام لینا چاہا، جو ہاتھ پاؤں انجام دیتے ہیں اور اب کمپیوٹر کے روز افزوں استعمال نے اسے بے دماغ بنانا شروع کر دیا ہے۔ امریکہ ہی نہیں، اس کے جلو میں ساری دنیا اسی روش پر گامزن ہے؛ لہٰذا اقدار، اصول یا اخلاق کا ذکر صدا بہ صحرا معلوم ہوتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مشین تعمیر و تخلیق کی بے پناہ قوت ہے، تاہم اس کا خالق انسان ہی ہے اور اسے جب احساس ہو گا کہ اس کا اصل مصرف انسانیت کی حاکمیت نہیں، بلکہ اس کی خدمت ہے تو موجودہ معاشرے کا ایک بڑا بحران ختم ہو جائے گا۔[۳۰]

☆ فاشزم کی ہم نوائی میں اقبال اشتراکیت اور ملوکیت دونوں کی مخالفت کرتے ہیں، لیکن اس حد تک، جس حد تک متوسط طبقے کا ایک آدمی کر سکتا ہے۔

هر دو را جاں ناصبور و ناشکیب — هر دو یزداں ناشناس، آدم فریب
زندگی ایں را خروج آں را خراج — درمیانِ ایں دو سنگ آدم زجاج

غرقِ دیدم هر دو را در آب و گل — هر دو را تن روشن و تاریک دل[۳۱]

چنانچہ سرمایہ داری اور ملوکیت کی بیخ کنی اور نئے معاشی نظام کی تشکیل کے لیے اقبال ایک عالمی تصور پیش کرتے ہیں، تاہم اقبال کے نزدیک، اس تصور کا عامل کوئی بین الاقوامی طبقہ نہیں، بلکہ ایک قوم [مسلمان] ہے۔[۳۲]

☆ اطالوی فاشسٹوں کی کامیابیوں پر اقبال کی مسرت[۳۳] کا ذکر کرتے ہوئے اختر ان کی نظم 'مسولینی' سے اقتباس پیش کرتے ہیں:

رومۃ الکبریٰ دگرگوں ہو گیا تیرا ضمیر — ایں کہ می بینم بہ بیداریست یا رب یا بخواب
چشمِ پیرانِ کہن میں زندگانی کا فروغ — نوجواں تیرے ہیں سوزِ آرزو سے سینہ تاب
یہ محبت کی حرارت، یہ تمنا، یہ نمود! — فصلِ گل میں پھول رہ سکتے نہیں زیرِ حجاب
نغمہ ہائے شوق سے تیری فضا معمور ہے — زخمہ ور کا منتظر تھا تیری فطرت کا رُباب
فیض یہ کس کی نظر کا ہے، کرامت کس کی ہے — وہ کہ ہے جس کی نگہ مثلِ شعاعِ آفتاب[۳۴]

اس مقام پر اختر تلخ ہو جاتے ہیں، کہتے ہیں کہ یہ فیض مسولینی کا ہے، جو اطالیہ کی بہبود کے لیے ساری دنیا کو فنا کر سکتا ہے؛ جو اطالیہ کے سرمایہ داروں کا سپہ سالار ہے؛ جو جنگ کو انسانیت کے لیے شیرِ مادر بتاتا ہے۔ اقبال ایسے ڈکٹیٹر کو ہی اسلامی پاکستان کے استحکام کا ضامن سمجھتا ہے۔[۳۵]

آل احمد سرور کے خیال میں بعض لوگ اس وجہ سے دھوکا کھا جاتے ہیں کہ بالِ جبریل میں اقبال نے ایک نظم میں مسولینی کی تعریف کی ہے اور روما کی مردہ سرزمین میں زندگی کی حرارت پیدا کرنے پر اسے مبارک باد دی ہے...... حالانکہ وہ ضربِ کلیم کی نظم [مسولینی] کو بھول جاتے ہیں۔[۳۶]

یاد رہے کہ اختر نے مذکورہ مضمون علی گڑھ میں اپنے زمانۂ طالب علمی میں (اکتوبر ۱۹۳۴ء سے قبل) لکھا تھا، تاہم ان کے اس جملے ...... یہ فیض مسولینی کا ہے، جو اطالیہ کی بہبود کے لیے ساری دنیا کو فنا کر سکتا ہے ...... سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی تکمیل شاید حبشہ پر اطالیہ کے حملے (۵ دسمبر ۱۹۳۴ء) کے دنوں میں ہوئی؛ چنانچہ یہ کیسے ممکن تھا کہ اختر ۱۹۳۴ء کے اواخر میں اُس نظم (مسولینی، مشمولہ ضربِ کلیم) کو مدنظر رکھتے، جو ۲۲/اگست ۱۹۳۵ء کو لکھی جانے والی تھی۔

اقبال سے اختر کی آخری ملاقات ۲۶/اکتوبر ۱۹۳۵ء[۳۷] کو پانی پت میں حالی کے صد سالہ یومِ ولادت کے جلسے میں ہوئی۔[۳۸] حفیظ جالندھری[۳۹] نے اقبال سے شکایت کی کہ یہ [اختر] آپ کی شان میں سخن گسترانہ باتیں لکھ گئے ہیں۔ علامہ نے شفقت سے فرمایا: مَیں ایسے مخلص نوجوانوں کی قدر کرتا ہوں اور بے جان لوگوں کے اتفاق پر جان دار لوگوں کے اختلاف کو ترجیح دیتا ہوں۔[۴۰]

۱۰/نومبر ۱۹۳۸ء کو ’بنگال کا باغی شاعر ...... نذر الاسلام،‘[۴۱] لکھتے ہوئے اختر، اقبال کی اہمیت کو کسی حد تک تسلیم کرنے لگے تھے، کہتے ہیں:

> اگر ہم مان لیں کہ ٹیگور[۴۲] نے دانستہ کسی فلسفۂ زندگی کی تلقین نہیں کی تو یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ہند جدید کے دو سب سے بڑے مفکر شاعر: اقبال اور نذر الاسلام مسلمان تھے۔ گو وہ دو متضاد رجحانات کے پیشوا تھے، لیکن انھیں وہ بے چینی متحرک کر رہی تھی، جو مسلمانوں کے جمود کو دیکھ کر ہر ذی حس میں پیدا ہو جاتی ہے۔ ایک پیچھے کی طرف بلاتا تھا اور دوسرا آگے کی طرف بڑھاتا تھا، لیکن دونوں حرکت اور عمل کی دعوت دیتے تھے اور سرمایہ داری و سامراج کے دشمن تھے۔ ہندوستانی شاعری کو ان دونوں کی ایک بڑی دین یہ بھی تھی کہ اس میں انھوں نے زندگی کے مقاصد کو بیان کرنے کی صلاحیت پیدا کی۔[۴۳]

ٹیگور کے مقابلے میں ہندوستانی شاعری کو اقبال اور نذر الاسلام کی ’بڑی دین‘ کے اعتراف کے بعد اپنے ایک اَور مضمون میں اختر نے لکھا کہ اردشیر خبردار[۴۴] کی قومی شاعری میں وہ ولولہ اور جوش نہیں، جو اقبال اور نذر الاسلام کے ہاں بدرجۂ اتم موجود ہے۔[۴۵]

نذر الاسلام کی منتخب نظموں کے تراجم پر مشتمل مجموعے پیامِ شباب [۱۹۳۹ء] کے دیباچے میں اختر نے اقبال کا ذکر اس انداز میں کیا:

> اس مجموعے کی تکمیل کے وقت ہمیں یاد آتا ہے کہ اس کی چند نظمیں ایک موقع پر ہم نے اقبال مرحوم کو دکھائیں تو وہ بہت خوش ہوئے اور ہم سے دیر تک نذر الاسلام کا ذِکر کرتے رہے۔ انھوں نے یہ بھی فرمایش کی کہ انھیں کتابی صورت میں شائع کیا جائے۔ افسوس کہ اقبال آج ہم میں نہیں ہیں۔ وہ نذر الاسلام کے خیالات کے سخت مخالف تھے، لیکن اس کے شاعرانہ کمال کے بڑے معترف تھے؛ اس کاوش کی وہ یقیناً داد دیتے۔[۴۶]

مئی ۱۹۴۳ء میں ایک مضمون 'جنگ اور ادب' میں، نو آبادیاتی ممالک میں سیاسی بیداری کے حوالے سے لکھا کہ اقبال کے مردِ مومن، پریم چند کے ستیہ گرہی کسان اور نذر الاسلام کے باغی نوجوان،[۴۷] سب کی رُوح اس رشتہ میں وابستہ ہے، جو انسان کو قومیت، مذہب اور زبان کے اختلاف سے بالاتر کر دیتا ہے۔[۴۸]

اسی برس ایک اَور مضمون 'اُردو ادب کے جدید رجحانات: ۱۹۳۳ء تا ۱۹۴۳ء' میں اختر نے اقبال کے متعلق دو بیانات دیے۔ ایک میں ترقی پسند تحریک کے فروغ میں اقبال کی رحلت کو اہم واقعہ قرار دیا[۴۹] اور دوسرے میں اقبال کی رحلت کے بعد ان کے شاعرانہ اثرات کے زوال اور فلسفیانہ اثرات کے فروغ کا ذکر کیا۔[۵۰]

یہاں تک پہنچتے پہنچتے وہ اقبال کی عظمت کو کسی حد تک تسلیم کرنے لگے تھے، تاہم ادب اور انقلاب کی اشاعت (اکتوبر ۱۹۴۳ء) کے وقت 'ادب اور زندگی' پر کیے گئے اعتراضات کے جواب میں اختر نے اپنے موقف کے دفاع کے لیے جو وضاحتی انداز اپنایا، وہ اقبال پر اعتراضِ مزید کا کام کرتا ہے:

> دوسرا اہم اعتراض یہ ہے کہ ہم نے اقبال مرحوم سے بے انصافی کی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ دانستہ فاشسٹ نہ تھے اور مغربی سامراج کے دشمن تو تھے ہی۔ ہم نے اقبال کی سامراجیت دشمنی کا اعتراف کیا ہے، لیکن واضح رہے کہ ہر غلام ملک کے فاشسٹ بیرونی سامراج کے سخت مخالف اور قومی آزادی کے خواہاں ہوتے ہیں۔ اصل سوال تو یہ ہے کہ ملک وقوم کو سیاسی آزادی دلا کر کس طرف لے [جایا] جاتا ہے۔ اقبال کا فلسفۂ زندگی کہتا ہے کہ دنیا کو سائنس اور مشینی صنعت سے منہ موڑ کر قدیم مذہبی نظام کی طرف آنا چاہیے، جس کی تدوین مومنوں کے ہاتھ ہو گی۔ یہ نظام قائم کرنے کے لیے شاہین کی مثال پر عمل کرنا ہو گا، یعنی بوقتِ ضرورت جبر سے کام لینا ہو گا۔ ظاہر ہے کہ مغربی سائنس اور صنعت کی مخالفت اور ایک بہتر اخلاقی نظام کے نام پر ایک اقلیت کی ڈکٹیٹری فاشزم کے بنیادی عناصر ہیں۔ قالب میں فرق ہو سکتا ہے، لیکن روح وہی ہے۔ اقبال کے کلام میں مشرق و مغرب کا تنازعہ کوئی ترقی پسند خیال نہیں، بنیادی طور پر یہی تعصب جاپانی فاشسٹوں میں پایا جاتا ہے۔[۵۱]

ان 'الزامات' و 'اعتراضات' کا جواب نہ صرف ماہرینِ اقبالیات دے چکے، بلکہ بعض نامور ترقی پسند ناقدین نے اقبال کا دفاع کیا ہے۔

مارچ ۱۹۷۱ء میں ایک سوال کے جواب میں اختر نے کہا کہ اقبال کے فکری نظام کو فاشزم سے دانستہ مناسبت نہیں۔ اگرچہ نیٹشے کے 'super-man' اور اقبال کے 'مردِ کامل' میں کافی حد تک مناسبت ہے، تاہم اس یکسانیت کی جڑیں نہ تو زیادہ مضبوط ہیں اور نہ گہری۔ ان کے خیال میں افراط و تفریط سے قطع نظر اقبال کے سیاسی فلسفے کا ازسرِ نَو جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔[۵۲]

جون ۱۹۷۶ء میں افکار میں شائع ہونے والی گرد راہ کی تیسری قسط بہ عنوان 'علم و ادب کی سمتیں'

میں اختر نے اقبال سے متعلق اپنے خیالات سے رجوع کرتے ہوئے اعتراف کیا کہ:

اُس وقت مَیں نے اقبال کا کلام جستہ جستہ پڑھا تھا۔ اب انصاف کا تقاضا ہے کہ ان کی شاعری اور شخصیت کا اقرار کروں۔ غمِ دوراں کا ایسا نوحہ خواں اور عظمتِ انساں کا ایسا قصیدہ خواں بیسویں صدی میں کوئی شاعر نہ ہوا۔[۵۳]

جون ۱۹۸۱ء میں انھوں نے کہا کہ علامہ اقبال نہ صرف بڑے شاعر تھے، بلکہ بڑے انسان بھی تھے:

بعد میں ان کا کلام پڑھ کر مجھ میں اُسے سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہوئی اور وقت کے ساتھ ساتھ ان کی شخصیت کا احترام بھی بڑھتا گیا۔[۵۴]

اختر کا کہنا ہے کہ قافیہ بند نظم کے امکانات کو اقبال جیسے با کمال نے وہ عروج بخشا کہ اس میں کسی اضافے کی گنجائش نہ رہی[۵۵] اور یہ کہ شاعری کو جذبات کا ترجمان بنانے کے بجائے افکار کی ترسیل کا ذریعہ بنا کر اقبال نے اُردو شاعری میں غزل کی گرفت کو کم زور کر دیا۔[۵۶]

اقبال کے صد سالہ جشن ولادت کے موقع پر اختر نے 'بیسویں صدی کی شاعری میں اقبال کا مرتبہ' کے موضوع پر جامعہ کراچی میں دیے گئے ایک لیکچر میں کہا کہ بیسویں صدی کا طرۂ امتیاز اس کا فکری عنصر ہے اور اس ضمن میں اقبال کا نام ایلیٹ[۵۷] اور رلکے[۵۸] کے ساتھ لیا جائے گا۔[۵۹]

اختر کے خیال میں، اقبال روایتی تصوف کے قائل نہیں تھے؛ بلکہ انھوں نے انسانوں، بالخصوص مسلمانوں کو روحانی اور ذہنی طور پر بیدار کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے سامنے ایک مقصد اور ایک فلسفۂ زندگی تھا۔[۶۰]

اختر کہتے ہیں کہ اقبال شعوری طور پر تکنیک اور زبان و بیان کو اہمیت نہیں دیتے تھے، حالاں کہ وہ ان کی شاعری میں موجود ہیں۔[۶۱]

اقبال بھی نوبیل انعام کے مستحق تھے، تاہم بقول اختر حسین:

انھیں نوبیل پرائز نہ ملنے کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ یورپ کے ادبی حلقے ابھی ان سے واقف نہیں ہوئے تھے۔ ٹیگور بھی جب انگلستان گئے تھے تو ان کی بنگالی نظمیں کوئی نہیں سمجھتا تھا۔ ٹیگور نے ذہانت کا ثبوت دیا اور انگریزی میں لکھنا شروع کر دیا۔ پھر یہ کہ یورپ کے ادبی حلقوں میں ٹیگور کا تعارف ایک ایسے آدمی نے کرایا، جو خود بھی انعام یافتہ تھا، یعنی ڈبلیو بی ییٹس۔[۶۲] یقیناً اقبال کی انگریزی ٹیگور سے زیادہ اچھی تھی اور پروفیسر نکلسن[۶۳] نے خودی اور اسرار خودی[۶۴] کا ترجمہ کیا تھا، اس کے باوجود اُس وقت تک یورپ کے لوگ اقبال کے شاعرانہ کمالات سے آشنا نہیں ہوئے تھے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ اقبال کی طبیعت میں بڑی بے نیازی تھی، حالاں کہ یہ بڑا اعزاز تھا، لیکن انھوں نے نہ کبھی اس کی خواہش ظاہر کی اور نہ اس کا ذِکر کیا۔ وہ واقعی قلندر اور صوفی منش انسان تھے۔[۶۵]

اختر کے خیال میں، اگر نوبیل پرائز نہ ملے تو عظمت میں کمی نہیں آتی، تاہم اقبال ہر لحاظ سے نوبیل پرائز کے حق دار تھے۔[۶۶]

حوالے و حواشی

۱- تنقید: ادب اور انقلاب ۱۹۴۳ء، سنگِ میل ۱۹۴۹ء اور رَوشن مینار ۱۹۵۸ء۔
افسانے: محبت اور نفرت ۱۹۳۸ء اور زندگی کا میلہ ۱۹۵۶ء۔
تراجم: شکنتلا ۱۹۳۹ء، پیامِ شباب ۱۹۴۰ء، پیاری زمین ۱۹۴۱ء، میرا بچپن ۱۹۴۱ء، روٹی کی تلاش ۱۹۴۲ء اور جوانی کے دن ۱۹۴۵ء۔
تالیف: حبش اور اطالیہ ۱۹۳۵ء۔
خودنوشت: گرد راہ ۱۹۸۴ء۔

۲- میٹرک: گورنمنٹ ہائی اسکول، راے پور ۱۹۲۸ء۔
ایف اے: وِدّیا ساگر کالج، کلکتہ ۱۹۳۱ء۔
بی اے: مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ ۱۹۳۴ء۔
پی ایچ ڈی: سوربون یونی ورسٹی، پیرس ۱۹۴۰ء۔

۳- اُردو، فارسی، ہندی، سنسکرت، بنگالی، گجراتی، انگریزی اور فرانسیسی۔

۴- آل انڈیا ریڈیو، دہلی: ۱۹/جولائی ۱۹۴۰ء تا ۲۰/جون ۱۹۴۲ء۔
پروفیسر تاریخ اور وائس پرنسپل: ایم اے او کالج، امرتسر: اکتوبر ۱۹۴۲ء تا جولائی ۱۹۴۵ء۔
برطانوی حکومت ہند کے مشیر تعلیم: یکم اگست ۱۹۴۵ء تا تقسیم ہند۔
پاکستان میں معاون مشیر تعلیم، ڈپٹی مشیر تعلیم، ڈپٹی سیکرٹری تعلیم، قائم مقام مشیر تعلیم، صدر ثانوی تعلیمی بورڈ: ۱۶/اگست ۱۹۴۷ء تا مارچ ۱۹۵۶ء۔

۵- فرانس...... پیرس (۷/مارچ ۱۹۵۶ء)۔
پاکستان...... کراچی (۱۲/جولائی ۱۹۵۸ء)۔
صومالیہ...... موگادیشو (۱۹۶۵ء)۔
ایران...... تہران (۲۸/نومبر ۱۹۶۸ء)۔
فرانس...... پیرس (اواخر ۱۹۷۰ء تا ۱۱/جون ۱۹۷۲ء)۔

۶- کمال اتا ترک [مصطفیٰ کمال پاشا] (۱۸۸۱ء-۱۹۳۸ء) جدید ترکی کے بانی۔ مسلسل چار بار (۱۹۲۳ء-۱۹۳۸ء) جمہوریہ ترکی کے صدر رہے۔

۷- رؤف بے سے اقبال کی پہلی ملاقات لندن میں منعقدہ گول میز کانفرنس کے موقع پر ۱۶/اکتوبر ۱۹۳۱ء کو ہوئی، جو تین گھنٹے تک جاری رہی۔ رؤف بے نے مصطفیٰ کمال پاشا کی سرکردگی میں ترکی کی جنگ آزادی میں حصہ لیا تھا، لیکن بعد میں ان سے اختلاف کی بنا پر ۱۹۲۴ء میں جلاوطن کر دیے گئے۔

۸- زندہ رُود، ص ۵۶۶۔

۹- کامل القادری، ماہِ نو کراچی، مارچ ۱۹۷۱ء، ص ۴۱۔

۱۰- ڈاکٹر مختار احمد انصاری (۱۸۸۰ء-۱۰/مئی ۱۹۳۶ء) طبیب اور سیاست دان۔ بنارس سے طب کی سند اور لندن سے

ڈاکٹریٹ آف میڈیسن اور ماسٹر آف سرجری کی ڈگریاں حاصل کیں۔ چیئرنگ کراس ہسپتال، لندن کے پہلے ہندوستانی سرجن۔ جنگ بلقان میں ہندوستانی ڈاکٹروں کا وفد لے کر ترک مجاہدوں کی مرہم پٹی کرنے گئے۔ ۱۹۲۷ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی کا نظم ونسق سنبھالا۔

۱۱- علی بخش (۱۸۸۳ء-۲؍جنوری ۱۹۶۹ء) اقبال کے ملازم، جو ۱۹۰۳ء سے ۱۹۳۸ء تک ان کی خدمت میں حاضر رہے۔ چک ۱۸۸۔ رب (چک جھمرہ) فیصل آباد میں مدفون ہیں۔

۱۲- طاہر مسعود: یہ صورت گر کچھ خوابوں کے، ص ۸۶۔

۱۳- گرد راہ، ص ۸۳ تا ۸۵۔

۱۴- کامل القادری، ماہِ نو کراچی، مارچ ۱۹۷۱ء، ص ۴۲۔

۱۵- ایضاً۔

۱۶- افکار (نذرِ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری)، کراچی، مئی ۱۹۸۶ء۔

۱۷- گرد راہ، ص ۱۱۸۔

۱۸- غیر مطبوعہ (مملوکہ: راقم)۔

۱۹- یہ مضمون مولوی عبدالحق کی زیرِ ادارت انجمن ترقی اُردو ہند کے جریدے اُردو [اورنگ آباد، جولائی ۱۹۳۵ء، ص ۴۹۹] میں شائع ہوا اور بعد ازاں ادب اور انقلاب [ادارہ اشاعتِ اُردو، حیدرآباد دکن ۱۹۴۳ء، ص ۱۴ تا ۱۱۰] میں شامل ہوا۔

۲۰- جمال الدین افغانی (۱۸۳۸ء-۱۸۹۷ء)۔ شہزاد منظر، اختر کے ان خیالات پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اقبال اگر پین اسلام ازم کے تحت اسلام کا احیا چاہتے تھے تو کوئی حیرت کی بات نہیں ہے، کیوں کہ یہ دوسری عالمی جنگ شروع ہونے سے قبل کی دنیاے اسلام کا عام رجحان تھا اور اس رجحان کے بانی جمال الدین افغانی تھے۔ اختر حسین اگر جمال الدین افغانی کی تحریک اتحاد بین المسلمین اور علامہ اقبال کے احیائی رجحان کے خلاف تھے اور اس بنا پر ان پر معترض تھے تو یہ بھی ان کے مسلک کا تقاضا تھا۔ (اختر حسین رائے پوری کا تصورِ ادب، مشمولہ ادبیات، شمارہ ۲۷ تا ۳۰، ص ۸۲۹)۔

تاہم ڈاکٹر محمد علی صدیقی نے اپنے ایک مضمون 'مولانا جمال الدین افغانی' (تحریک اسلامی کے مدبر یا مہم جو رہنما؟) میں......وسط ایشیائی اسلامی ریاستوں میں ہولناک خوں ریزی کے باوجود برطانوی سامراج کے خلاف روس کو نجات دہندہ......اور بعد ازاں...... جنگ آزادی کے ردِعمل میں برطانوی استعمار کی طرف سے مسلمانانِ ہند کے قتل عام اور غارت گری کے باوجود روسی سامراج کے خلاف برطانیہ کو نجات دہندہ......قرار دینے پر سخت تنقید کی ہے۔ صدیقی صاحب کہتے ہیں: مقامِ حیرت ہے کہ برصغیر ہند و پاک کے بعض اہم رہنما پین اسلام ازم کے پردے میں متضاد سامراجوں کی باہمی چپقلش نہ دیکھ سکے۔ ان کے خیال میں برصغیر کے اکثر مسلم رہنما مولانا جمال الدین افغانی کے بارے میں غیر ضروری طور پر رطب اللسان نظر آتے ہیں۔ حیرت ہے کہ علامہ اقبال بھی ان رہنماؤں میں شامل ہیں، جنھوں نے تحریکِ خلافت کے اندرونی تضاد کو ٹھیک وقت پر محسوس کر لیا تھا، لیکن وہ مولانا جمال الدین افغانی کے پین اسلام ازم کے بارے میں معاملہ کی تہہ تک نہ پہنچ سکے۔ (جہات، ص ۵۱، ۵۲)۔

۲۱- نیتشے [Friedrich Nietzdhe] (۱۸۴۴ء-۱۹۰۰ء) جرمن مجذوب فلسفی۔ اقبال کے 'مردِ مومن' کو اسی کے 'فوق البشر' کے ساتھ نتھی کرنے کی کوشش کی جاتی رہی ہے، حالاں کہ خیر و شر کی بابت دونوں کے ہاں طاقت کے استعمال

کے بارے میں نقطۂ نظر یکسر مختلف ہے۔ بہر حال جرمن ڈکٹیٹر ہٹلر نے اسی کے 'فوق البشر' کو پیشِ نظر رکھ کر اپنی سیاسی جماعت کی بنیاد رکھی تھی۔۔

۲۲- برگساں [Henri Bergson] (۱۸۵۹ء-۱۹۴۱ء) فرانسیسی فلسفی۔ نوبیل انعام یافتہ: ۱۹۲۷ء۔

۲۳- جوزپے میزینی [Mazzini Giuseppe] (۱۸۰۵ء-۱۸۷۲ء) اطالوی قوم پرست اور انقلاب پسند۔

۲۴- مسولینی [Bonigo Mussolini] (۱۸۸۳ء-۱۹۴۵ء) اطالیہ کا فاشسٹ۔ اولاً اس نے سوشلسٹ تحریک میں حصہ لیا، بعد ازاں ۱۹۰۵ء میں فوج میں بھرتی ہو گیا۔ پہلی عالمی جنگ میں اطالیہ کی جنگ میں مداخلت کی وکالت کرنے کی پاداش میں اسے ۱۹۱۴ء میں سوشلسٹ تحریک سے بے دخل کر دیا گیا۔ ۱۹۱۹ء میں اس نے پُرتشدد قوم پرستی اور حکومت مخالف نظریات کی بنیاد پر ایک پارٹی تشکیل دی۔ یوں اسے صنعت کاروں اور جاگیرداروں کے ساتھ ساتھ پولیس اور فوج کی حمایت حاصل ہو گئی، چنانچہ ۱۰/۱ اکتوبر ۱۹۲۲ء میں شاہِ اطالیہ اور فوج نے اسے وزیرِ اعظم کا عہدہ پیش کر دیا۔ ۱۹۲۵ء تک اس نے حکومت کے تمام اختیار اپنے ہاتھ میں لے کر مخالف جماعتوں کو غیر قانونی قرار دے دیا۔ ایک برس بعد ملک کے عدالتی، سیاسی اور تعلیمی نظام کو فاشیزم کے اصولوں کے مطابق بدلنا شروع کر دیا۔

ڈاکٹر جاوید اقبال کے خیال میں جب اقبال، مسولینی سے ملے تو وہ اپنے عروج پر تھا اور اپنی قوم کا نجات دہندہ سمجھا جاتا تھا۔ اس نے اطالوی قوم میں زندگی کی نئی روح پھونکی تھی اور اس کے جوشِ خطابت کے سبب نوجوانوں کے سینے آرزوؤں سے تنے ہوئے تھے۔ ہر کوئی کسی نہ کسی تعمیری کام میں مصروف تھا۔ ملک تیزی سے ترقی کی طرف رواں تھا اور اقبال کو یقین تھا کہ اطالوی نوجوانوں کی گرم جوشی، ان کے عمل کی شگفتگی اور جذبات کی بلندی مسولینی ہی کے فیضِ نظر یا کرامت کا نتیجہ ہے۔ (زندہ رُود، ص ۵۲۱)

لندن میں منعقدہ گول میز کانفرنس میں شرکت کے بعد اقبال پیرس کے راستے ۲۲ نومبر ۱۹۳۱ء کو روم پہنچے اور ۲۷ نومبر کو مسولینی سے ملاقات کی۔ غلام رسول مہر، سر میلکم ڈارلنگ اور فقیر وحید الدین نے متضاد معلومات فراہم کی ہیں، تاہم یہاں آل احمد سرور کے نام اقبال کے ایک خط (مرقومہ: ۱۲/ مارچ ۱۹۳۷ء) سے اقتباس پیش کیا جاتا ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ مسولینی کے متعلق جو کچھ مَیں نے لکھا ہے، اس میں آپ کو تناقض نظر آتا ہے۔ آپ درست فرماتے ہیں، لیکن اگر اس بندۂ خدا میں devil (شیطان) اور saint (ولی) دونوں کی خصوصیات جمع ہوں تو اس کا مَیں کیا علاج کروں۔ مسولینی سے اگر کبھی آپ کی ملاقات ہو تو آپ اس بات کی تصدیق کریں گے کہ اس کی نگاہ میں ایک ناممکن البیان تیزی ہے، جس کو شعاعِ آفتاب سے ہی تعبیر کر سکتے ہیں، کم از کم مجھے اسی قسم کا احساس ہوا۔ (اقبال نامہ: مرتبہ شیخ عطاء اللہ، حصہ دوم، ص ۳۱۴)

اقبال کے اس بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر جاوید اقبال کہتے ہیں کہ اقبال نے مسولینی کی نگاہ کی جس ناممکن البیان تیزی کا ذکر کیا ہے، وہ دراصل ذہنی طور پر بیمار مجرموں اور قاتلوں کی نگاہوں میں محسوس کی جا سکتی ہے۔ ایسی تیزی انتہائی بے چینی کی علامت ہوتی ہے اور اس ناممکن البیان بے چینی ہی کے عالم میں کسی بڑے جرم یا قتل کا ارتکاب کیا جاتا ہے۔ (زندہ رُود، ص ۵۲۱)

۲۵- جمہوریت: پیامِ مشرق، ص ۱۳۵۔

۲۶- بالِ جبریل، ص ۵۰۔

۲۷- قیصرِ ولیم: پیامِ مشرق، ص ۲۱۰۔

۲۸- لینن (خدا کے حضور میں): بالِ جبریل، ص۱۱۱۔

۲۹- 'رجعت اور ٹیگور' (ادب اور زندگی) مشمولہ ادب اور انقلاب، ص۷۹۔

۳۰- گرد راہ، ص۲۵۴-۲۵۵۔

۳۱- اشتراکیت وملوکیت مشمولہ جاوید نامہ، ص۶۵۔

۳۲- ادب اور زندگی، ادب اور انقلاب، ص۸۵-۸۶

۳۳- فاشسٹ نوجوانوں سے اقبال کی وابستگی اس انٹرویو سے بھی نمایاں ہوتی ہے، جو بیت المقدس میں منعقدہ مؤتمر عالم اسلامی کے اجلاس میں شرکت کے بعد لاہور پہنچنے پر انھوں نے یکم جنوری ۱۹۳۲ء کو سول اینڈ ملٹری گزٹ کو دیا تھا۔ ایک سوال کے جواب میں اقبال نے کہا کہ سفرِ فلسطین میری زندگی کا نہایت دلچسپ واقعہ ثابت ہوا ہے۔ فلسطین کے زمانۂ قیام میں متعدد اسلامی ممالک کے نمایندوں سے ملاقات ہوئی۔ شام کے نوجوان عربوں سے مل کر مَیں خاص طور پر متاثر ہوا۔ ان نوجوانانِ اسلام میں اس قسم کے خلوص و دیانت کی جھلک پائی جاتی تھی، جیسی مَیں نے اطالیہ میں فاشسٹ نوجوانوں کے علاوہ کسی میں نہیں دیکھی۔ (گفتار اقبال، مرتبہ: محمد رفیق افضل، ص۱۴۵ تا ۱۴۶)

پروفیسر آل احمد سرور کہتے ہیں کہ اقبال بعض اوقات صبحَ کاذب کو صبحِ صادق سمجھ لیتے تھے۔ (عرفان اقبال، ص ۹۴) اسی صورتِ حال پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر جاوید اقبال لکھتے ہیں کہ اقبال بعض سیاسی شخصیات [شاہ امان اللہ خان، محمد نادر شاہ، مصطفیٰ کمال پاشا، رضا شاہ پہلوی] سے ایسے ہی [یعنی مسولینی کی طرح] متاثر ہوئے تھے۔ گو بعد میں انھیں کسی نہ کسی بِنا پر مایوس ہونا پڑا۔ (زندہ رُود، ص۵۲۱) بہرحال بقول جاوید اقبال جب مسولینی نے ابی سینیا پر حملہ کر کے اس چھوٹے سے نادار ملک پر قبضہ کر لیا تو وہ ان کی نگاہوں میں گر گیا اور اقبال اسے بھیڑیے کی قسم کا درندہ تصور کرنے لگے۔ (ایضاً) اور انھوں نے ۲۲/اگست ۱۹۳۵ء کو بھوپال میں 'مسولینی (اپنے مشرقی اور مغربی حریفوں سے)' کے نام سے دوسری نظم لکھی۔

اسی سال اختر حسین رائے پوری نے حبش اور اطالیہ [مطبوعہ: ۱۹۳۶ء] کے نام سے ایک کتاب تالیف کی، جس میں حبش کے تاریخی وسیاسی پس منظر کے بعد حالاتِ جنگ قلم بند کیے۔

۳۴- بالِ جبریل، ص۱۵۶۔

۳۵- ادب اور زندگی، مشمولہ ادب اور انقلاب، ص۸۶-۸۷۔

۳۶- عرفان اقبال، ص۸۹۔

۳۷- اختر نے گرد راہ میں '۱۹۳۶ء کے آخر میں' لکھا ہے، جو غلط ہے۔ درست تاریخ بحوالہ زندہ رُود، ص۶۱۵۔

۳۸- ڈاکٹر جاوید اقبال (پ: ۲۳/مارچ ۱۹۲۴ء) نے حالی کے صد سالہ یومِ پیدایش کے جلسے کی مکمل رُودادِ ان الفاظ میں بیان کی ہے:

۲۵/اکتوبر ۱۹۳۵ء کو اقبال، چوہدری محمد حسین (۲۸/مارچ ۱۸۹۴ء-۱۶/جولائی ۱۹۵۰ء)، راجا حسن اختر (۲۵/دسمبر ۱۹۰۴ء-۱۵/اکتوبر ۱۹۶۴ء)، سید نذیر نیازی (۱۹۰۰ء- ۲۴/جنوری ۱۹۸۱ء)، علی بخش اور راقم کے ساتھ پانی پت پہنچے...... ۲۶/اکتوبر کو نواب بھوپال [نواب محمد حمید اللہ خاں: ۹/ستمبر ۱۸۹۴ء- ۱۹۶۰/۶۲ء] کی زیرِ صدارت، حالی اسکول میں تلاوتِ قرآنِ مجید سے جلسے کا آغاز ہوا۔ مولانا حالی کے فرزند خواجہ سجاد حسین نے سپاس نامہ پڑھا۔ حفیظ جالندھری (۱۴/جنوری ۱۹۰۰ء-۲۱/دسمبر ۱۹۸۲ء) نے اپنی نظم سنائی۔ اس کے بعد خواجہ غلام السیدین (۱۹۰۴ء-

۱۹۷۱ء) نے اعلان کیا کہ گلے کی خرابی کے سبب اقبال اپنے اشعار خود نہ سنائیں گے، بلکہ کوئی اَور صاحب ان کے اشعار سنائیں گے۔ اقبال سے درخواست کی گئی کہ شعر خوانی کے دَوران ڈائس پر تشریف لے آئیں۔ ان کے اس موقع پر لکھے ہوئے اشعار، جو انھوں نے پہلے ہی خواجہ سجاد حسین کو بھیج رکھے تھے، حالی اسکول کے ایک استاد نے خوش اسلوبی کے ساتھ پڑھ کر سنائے۔ اس کے بعد جمیل نقوی، غلام السیدین اور ڈاکٹر ذاکر حسین نے مولانا حالی سے متعلق اپنے اپنے مقالات پڑھے۔ پھر راس مسعود کا تحریر کردہ 'مسدس حالی' ایڈیشن کا دیباچہ پڑھا گیا۔ آخر میں نواب بھوپال نے خطبہ صدارت پڑھا اور جلسہ اختتام پذیر ہوا۔ زندہ رُود، ص ۶۱۵-۶۱۶۔

۳۹- حفیظ جالندھری (۱۴/جولائی ۱۹۰۰ء-۲۲/دسمبر ۱۹۸۲ء) معروف شاعر، پاکستان اور آزاد کشمیر کے قومی ترانوں کے خالق۔ شکایت کنندہ کا نام بحوالہ: یہ صورت گر کچھ خوابوں کے، ص ۸۶۔

۴۰- گرد راہ، ص ۸۵۔

۴۱- قاضی نذرالاسلام (۱۸۹۹ء-۳۰/اگست ۱۹۷۶ء) بنگالی کے عظیم انقلابی شاعر، افسانہ نگار، ناول نویس، ڈراما نگار، موسیقار۔ تقسیم ہند سے قبل ہی آزادی و حریت سے لبریز ان کی نظمیں ملک گیر شہرت حاصل کر چکی تھیں۔ رابندر ناتھ ٹیگور اپنی بنگالی میں سنسکرت الفاظ استعمال کرتے تھے، جب کہ نذرل نے اُردو، عربی اور فارسی الفاظ استعمال کر کے بنگالی زبان کو مالا مال کر دیا۔ اختر نے اس انقلابی شاعر کی متعدد نظموں کا ترجمہ کیا۔ یہ مجموعہ پیامِ شباب کے نام سے ۱۹۳۹ء میں انجمن ترقی اُردو ہند، دہلی سے شائع ہوا۔

۴۲- رابندر ناتھ ٹیگور (۶/مئی ۱۸۶۱ء-۱۹۴۱ء) بنگالی زبان کا عظیم شاعر، افسانہ نگار، ناول نویس، ڈراما نگار۔ ۱۹۱۳ء میں اسے نوبیل انعام ملا اور ۱۹۱۴ء میں برطانوی حکومتِ ہند نے اسے سر کا خطاب دیا، تاہم برطانوی استعماریت کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے اس نے ۱۹۱۵ء میں یہ خطاب واپس کر دیا۔

۴۳- ادب اور انقلاب، ص ۲۳۰۔

۴۴- اردشیر خبردار، نومبر ۱۸۸۱ء میں صوبہ بمبئی کے شہر دَمن میں ایک پارسی گھرانے میں پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم سے آگے نہ بڑھ سکا، تاہم شاعری سے اسے خاص شغف تھا اور محض سولہ برس کی عمر میں اس کے سو دوہوں پر مشتمل کتاب شائع ہوئی۔ اس کی فلسفیانہ نظموں کا گجراتی مجموعہ درشنکا کے نام سے اور انگریزی شاعری کے دو مجموعے شائع ہو کر قبول عام کا درجہ حاصل کر چکے ہیں۔ اختر کہتے ہیں کہ اس کا نظریۂ زندگی صحیح ہو یا نہ ہو، اس کی قادر الکلامی مسلّم الثبوت ہے۔ (سنگ میل، ص ۶۲-۶۳)

۴۵- 'گجرات کا باکمال شاعر: اردشیر خبردار' مشمولہ سنگِ میل، ص ۶۱-۸۰۔

۴۶- مقدمۂ پیام شباب، ص ۲۹۔

۴۷- نذرل کے 'باغی نوجوان' کو ان کی نظم 'بدروہی' سے جانا جا سکتا ہے، جس کا ترجمہ اختر نے بھی کیا۔ یہاں اس نظم کے پہلے اور آخری بند کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے:

پہلا بند: کہہ دے، اے جواں مرد! کہہ دے کہ مَیں سربلند ہوں
اتنا سربلند، اتنا سربلند کہ ہمالیہ کی چوٹی بھی میرے آگے سرنگوں ہے۔

کہہ دے، اے بہادُر! کہہ دے کہ اس وسیع آسمان کو چیر کر؛ چاند، سورج اور ستاروں کو توڑ کر؛ جنت و دوزخ کو دہلا کر اور عرش سے ٹکرا کر مَیں اس دُنیا کے لیے مجسمۂ حیرت بن گیا ہوں

کہہ دے، اے جواں مرد! کہہ دے کہ مَیں ہمیشہ سربلند رہوں گا۔　　(پیامِ شباب، ص۳۵)

آخری بند: مَیں باغیوں کا سردار ہوں۔

خوں خواری سے میرا جی بھر گیا ہے۔

مَیں اُسی دن مطمئن ہوں گا، جب مظلوموں کی فریاد فضاے آسمانی میں نہ گونجے گی۔

جب میدانِ جنگ میں تلوار اور خنجر کے خوف ناک ترانے نہ سنائی دیں گے۔ وہ باغی، جو جنگ و جدل سے نالاں ہے، اُسی روز خاموش ہوگا۔

مَیں وہ باغی 'بھرگو' ہوں، جس نے بھگوان کے دل پر اپنا نقش قدم ثبت کر دیا تھا۔

جو خیالی قسمت سارے ظلم و ستم کی جڑ ہے، مَیں اس کی بوند بوند پی جاؤں گا۔

مَیں وہ باغی ہوں، جو قسمت کے طلسم کو توڑ سکتا ہے۔

مَیں ہوں ازلی اور غیر فانی باغی۔

دُنیا کو ٹھکرا کر ایک بار پھر مَیں تنِ تنہا سر اُٹھا کر کھڑا ہوا ہوں۔　　(پیامِ شباب، ص۴۲-۴۳)

۴۸- ادب اور انقلاب، ص۲۶۱۔

۴۹- ایضاً، ص۲۷۲۔

۵۰- ایضاً، ص۲۷۷-۲۷۸۔

۵۱- ادب اور زندگی، مشمولہ ادب اور انقلاب۱۹۴۳ء اوّل۔

۵۲- کامل القادری، ماہ نو کراچی، مارچ ۱۹۷۱ء، ص۴۲۔

۵۳- افکار، جون ۱۹۷۶ء، ص۲۲۔

۵۴- یہ صورت گر کچھ خوابوں کے، ص۸۶۔

۵۵- گرد راہ، ص۱۵۱۔

۵۶- ایضاً، ص۲۷۶۔

۵۷- ٹی ایس ایلیٹ [Thomas Stearns Eliot] (۱۸۸۸ء-۱۹۶۵ء)۔ انگریز شاعر اور نقاد۔

۵۸- رِلکے [Rainer Maria Rilke] (۴/دسمبر ۱۸۷۵ء-۲۹/دسمبر ۱۹۲۶ء) جمہوریہ چیک کے دارالحکومت پراگ (Prague) میں پیدا ہوا۔ اس کے معروف شعری مجموعوں میں *Das Stunden Buch* اور *Neue Gedichte* شامل ہیں۔ اس کا شعری کلیات *The Complete French Poems of Rainer Maria Rilke* کے نام سے ۱۹۹۶ء میں شائع ہوا۔

۵۹- گرد راہ، ص۲۷۵۔

۶۰- یہ صورت گر کچھ خوابوں کے، ص۸۶۔

۶۱- ایضاً، ص۸۷۔

۶۲- ولیم بٹلر ییٹس [W B Yeats] (۱۸۶۵ء-۱۹۳۹ء) آئرلینڈ کا ممتاز شاعر۔

۶۳- پروفیسر نکلسن [Nicholson] (۱۸۶۸ء-۱۹۴۵ء) عربی و فارسی کا عالم۔ مثنوی معنوی اور کشف المحجوب کے علاوہ اقبال کی مثنوی اسرارِ خودی کا *The Secrets of the Self* کے نام سے انگریزی

ترجمہ کیا (مطبوعہ: میک ملن، لندن ۱۹۲۰ء)۔

۶۴- مراد ہے صرف: اسرارِ خودی [حکیم فقیر محمد چشتی نظامی، لاہور ۱۹۱۵ء]

۶۵- یہ صورت گر کچھ خوابوں کے، ص ۸۷

۶۶- ایضاً۔

❁……❁……❁

کتابیات

۱- آل احمد سرور، عرفان اقبال (مرتبہ: زہرا معین)، الاعجاز، لاہور، ۲۰۰۷ء

۲- اختر حسین رائے پوری، ڈاکٹر، آگ اور آنسو (ہندی)، وشوانی پرکاشن، الہ آباد، س ن

۳- اختر حسین رائے پوری، ڈاکٹر، ادب اور انقلاب، ادارہ اشاعت اُردو، حیدر آباد دکن، ۱۹۴۳ء

۴- اختر حسین رائے پوری، ڈاکٹر، پیاری زمین، انجمن ترقی اُردو ہند، دہلی، ۱۹۴۱ء

۵- اختر حسین رائے پوری، ڈاکٹر، پیامِ شباب، انجمن ترقی اُردو ہند، دہلی، ۱۹۳۹ء

۶- اختر حسین رائے پوری، ڈاکٹر، جوانی کے دن، انجمن ترقی اُردو ہند، دہلی، ۱۹۴۵ء

۷- اختر حسین رائے پوری، ڈاکٹر، حبش اور اطالیہ، انجمن ترقی اُردو، اورنگ آباد، ۱۹۳۶ء

۸- اختر حسین رائے پوری، ڈاکٹر، روٹی کی تلاش، انجمن ترقی اُردو ہند، دہلی، ۱۹۴۱ء

۹- اختر حسین رائے پوری، ڈاکٹر، روشن مینار، اُردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۱۹۵۸ء

۱۰- اختر حسین رائے پوری، ڈاکٹر، زندگی کا میلہ، نیشنل انفارمیشن اینڈ پبلی کیشنز، بمبئی، ۱۹۴۹ء

۱۱- اختر حسین رائے پوری، ڈاکٹر، سنگ میل، نیشنل انفارمیشن اینڈ پبلی کیشنز، بمبئی، ۱۹۴۹ء

۱۲- اختر حسین رائے پوری، ڈاکٹر، شکنتلا، انجمن ترقی ارو ہند، دہلی، ۱۹۳۹ء

۱۳- اختر حسین رائے پوری، ڈاکٹر، گرد راہ، مکتبہ افکار، کراچی، ۱۹۸۴ء

۱۴- اختر حسین رائے پوری، ڈاکٹر، محبت اور نفرت، ساقی بک ڈپو، دہلی، ۱۹۳۸ء

۱۵- اختر حسین رائے پوری، ڈاکٹر، میرا بچپن، انجمن ترقی اُردو ہند، دہلی، ۱۹۴۰ء

۱۶- اقبال، علامہ محمد، کلیاتِ اقبال اُردو، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۲۰۰۶ء

۱۷- اقبال، علامہ محمد، کلیاتِ اقبال فارسی، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۷۳ء

۱۸- جاوید اقبال، ڈاکٹر، زندہ رُود، سنگ میل، لاہور، ۲۰۰۴ء

۱۹- طاہر مسعود، یہ صورت گر کچھ خوابوں کے، مکتبہ تخلیق ادب، کراچی، ۱۹۸۵ء

۲۰- عطاء اللہ، شیخ، اقبال نامہ: دوم، شیخ محمد اشرف، لاہور، ۱۹۵۱ء

۲۱- محمد رفیق افضل، گفتارِ اقبال، ادارہ تحقیقاتِ پاکستان، دانش گاہِ پنجاب، لاہور، ۱۹۶۹ء

۲۲- محمد علی صدیقی، ڈاکٹر، جہات، ارتقا مطبوعات، کراچی، ۲۰۰۴ء

جرائد و رسائل

۱- سہ ماہی ادبیات، اسلام آباد، شمارہ ۲۷ تا ۳۰۔

۲- ماہنامہ افکار، کراچی، جون ۱۹۷۶ء۔

۳- ماہنامہ افکار، کراچی، مئی ۱۹۸۶ء، نذرِ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری۔

۴- ماہنامہ ماہِ نو، کراچی، مارچ ۱۹۷۱ء۔